

ان سویٹ آف رومز میں رہنا مشکل تھا جہاں چیزوں سے لے کر انسان تک بے قاعدہ
بے فائدہ لڑھکتے پھرتے تھے۔

کرائس کی رات سے بہت پہلے کی بات ہے، ایک روز پارونے آخری
بار آنکس سے مردار ہاتھی کی جلد مٹونکی۔

”اٹھو کچھ کرو گل رُخ خدا کے لئے۔ کب تک پیتے رہو گے؟“

”کیا کروں؟“ کروٹ لے کر گل رُخ نے پوچھا۔

”تم ایک بچے کے باپ بننے والے ہو۔ کچھ اسی کے لئے زندگی کے آثار پیدا کرو،
اپنے بچے کے لئے کچھ زندہ ہو جاؤ۔“

”وہ بھی آکر روتا رہے گا۔ رونے دو“ پاگل گئے مارلن برانڈو جیسا

گل رُخ بولابڑی نفرت سے پارونے کہا۔ ”پتہ ہے تم مجھے اس نیرو کی یاد
دلاتے ہو جو بنسری بجاتا رہا اور سارا روم جل گیا۔“

”ہاں ہم دونوں میں مشابہت ہے۔ دونوں کے لئے زندگی بے معنی ہے۔“

”گل رُخ تم یہ مت سمجھنا کہ میں ہمت ہار دوں گی میرے باپ کے نزدیک

سک انڈسٹری کوئی چیز نہیں ہے، وہ ہر مردہ فیکٹری میں روح پھونکھ سکتا ہے۔“

”پھر؟“

”میں تمہارے متعلق ایسی افواہ اڑاؤں گی کہ تمہارے گھر کا بچہ بچہ زندہ

ہو جائے گا۔۔۔۔۔ تم اگر میرے بچے کے لئے زندہ نہ ہوئے تو میں تمہیں زندہ

نہیں چھوڑوں گی۔ تم میں جلے پیر کی ہٹی آبلے گی اور تم یوں لیٹنا، بسورنا اور

ہوا خارج کرنا بھول جاؤ گے۔“

ایسے ہی ہوا۔

پارونے کاموں میراثن کی شہتوت رنگی کو بلا کر رازداری سے بتایا کہ

گل رُخ نامرد ہے اور اسی لئے پارو تینسج نکاح کے لئے کوشش کر رہی ہے۔
 شہتوت رنگی نے یہ تو سوال نہ کیا کہ اگر گل رُخ نامرد ہے تو پھر پارو بہو کیسے
 بھاری قدم لئے برآمدے میں پھرتی ہے۔ لیکن اس نے اس راز کو گیتو مہری
 کی بھانجی کو بتایا۔ بھانجی نے بہشتی کی سالی سے بات کی۔ ہریالی سالی نے
 پانچ مردوں میں قبہ قبہ لگا کر پرالی پھینکنے کے انداز میں بات کی.... اور سارے
 میں ڈھول تاشے بجنے لگے.... شہد کی مکھیاں پیغام لے کر آنے جانے لگیں۔
 اور گل رُخ کی تھڑی تھڑی ہو گئی تب آمنہ ملکائی نے حکم دیا کہ بزنس مینوں کے گھر سے
 پارو بہو کوئی ملنے نہیں آسکتا۔ اگر کوئی آیا تو واپس نہیں جاسکے گا وہ جس دم سے
 پارو کو مارنے کا دل ہی دل میں عہد کر چکی تھی۔ وہ تو کبھی کا پارو کو ختم کر دیتی۔
 پر پوتے کی آس نے پارو بہو کی زندگی بچائے رکھی۔

اس رات جب چھدی چھپے پارو کا ذہین خوبصورت بھائی کھڑکی ٹاپ کر
 اسے ملنے آیا تو وہ ترپ گئی۔

”تم کیسے آئے ہو ماجد۔ تمہیں یہاں کس نے آنے دیا۔ جانتے نہیں یہاں
 کے حالات کیسے ہیں؟ تمہیں کوئی مار دے گا یہ قوف“

”حویلی سے باہر کار کھڑی ہے۔ درختوں میں سے چھپ کر آیا ہوں۔

چلو.... ابھی وقت ہے آبانے بلایا ہے۔

پارو بہو نے خاموشی سے اٹیچی میں
 سامان رکھا۔ اس کے بھائی نے ابھی ایک جو تاجراب اُتار کر پتلون کا ایک پائینچہ
 وضو کرنے کے لئے اُٹھایا تھا کہ دروازہ دھڑ دھڑایا۔

پارو بہو نے دروازے کی جھری سے دیکھا اور پھر بھائی سے بولی۔
 ”جھاگ جاؤ۔ گل رُخ نشے میں ہے، تمہیں نہیں پہچانے گا مگر ملکائی کے کارندے

نہیں نہیں چھوڑیں گے۔ بھاگ جاؤ۔ ابھی اسی وقت:

ہوتے ہواتے، سمجھتے سمجھاتے، کھتے کھاتے، چلتے جلاتے، ملکانی نورافشاں آخر کو برآمدے میں رہنے لگی جیسے دھوپ کبھی ادھر کبھی ادھر برآمدے میں سائے چھوڑتی ہے، اسی طرح بڑی ملکانی کبھی اپنی کرسی ستون کے پاس، کبھی منی پلانٹ کے قریب اور کبھی قد آدم آئینوں سے بچ کر کھسکا لیتی لیکن رنج اس کا ہمیشہ ملک آصف کے کمرے کی طرف رہتا۔ یادوں نے اس سے آنکھ مچولی کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ملک آصف کے والد کا چہرہ یاد کرنا چاہتی لیکن وہ اس کے ذہن کی سکیرین پر نہ آتا۔ کمروں میں گئے لوگوں کی آوازیں اسے چونکا دیتیں۔ جوانی میں وہ چوروں سے ڈرتی تھی اب اسے موت سے خوف آتا تھا۔ وہ دنیا میں کسی چیز، واقعہ انسان کی منتظر نہ تھی پھر بھی آنے والی موت ہر حادثے، سانحے، بیماری، آفت، زلزلے سے مہیب تھی.....

وہ بہت باتیں یاد کرنا چاہتی تھی پر واقعات کا سر ملنے سے پہلے اسے اونگھ آجاتی۔ وہ کئی چہروں کے نام یاد کرنا چاہتی اور کئی ناموں کے چہرے بھول گئی تھی۔

ساری زندگی کا سفر برآمدے میں ایک کرسی کے سفر سے زیادہ نہ تھا۔ کبھی یہاں سرکالی، کبھی وہاں اٹھا کر رکھ دی۔ اگر کوئی اہم واقعہ تھا تو وہ ڈیکوریشن بیس کی طرح گم سم سمجھا تھا۔ نہ ہلکا تھا نہ بولتا تھا۔

جس روز سورج گرہن لگا اس روز دادی نورافشاں نے آسمان کی زرد روشنی دیکھ کر کئی بار لا حول پڑھی۔ ہر بار جب پارو بہو برآمدے میں آتی تو وہ کہتی۔ ”قیچی سوئی کو ہاتھ نہ لگانا پارو بہو، کون جانے والے پر کیا اثر ہو“

منہ جانے وہ کب کی بات تھی؟ — دادی نے سوچا خوب ایک بھیانک سیدھیج کے ساتھ پارو بہو اپنے کمرے سے نکلی کچھ مزارع گل رُخ کو اٹھائے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ پھر آمنہ ملکانی بغیر دوپٹے کے سینہ کو ٹٹی آئی۔ جس وقت مزارعوں نے سیاہ مرسڈیز میں سے نکال کر گل رُخ کی لاش کو ملکانی نور افشاں کے پاس تخت پوش پر ڈالا۔ اچانک سورج گرہن میں سے نکل گیا اور سارے میں سورج کی روشنی پھیل گئی۔

تخت پوش کے گرد آمنہ ملکانی، پارو بہو اور ملک آصف کھڑے تھے۔ دادی گل افشاں نے اپنے بدانتظام آصف کو دیکھا۔ وہ سوچنا چاہتی تھی کہ اس کے باپ کا چہرہ کیسا تھا لیکن اسے کچھ بھی یاد نہ آ رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھنا چاہا کہ گل رُخ اچانک کیسے رخصت ہوا؟

کیا اس نے خودکشی کی؟
کیا کسی دشمن نے مروا ڈالا؟
کیا کوئی حادثہ ہوا؟

لیکن پھر ملکانی نور افشاں نے پارو بہو کی طرح لب کاٹا اور آمنہ ملکانی کی طرح رونے لگی۔ ایک عرصہ ہوا اس نے سوال پوچھنا بند کر دیئے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ سوالوں کا جواب کبھی نہیں ملتا۔ تسلی ملتی ہے، جھوٹ حاضر کئے جاتے ہیں لیکن سوال ادھورے رہتے ہیں۔ پھر دادی نور افشاں نے اپنی اتنی لمبی زندگی کو ایک سانس میں دیکھ کر سوچا۔

پوچھنے کا فائدہ بھی کیا ہے؟ اس دار الفنا میں ہوتا ہوا آکھ نہیں۔ بس آدمی پھیرا لگانے آتا ہے۔ آتا ہے اور چلا جاتا ہے اور اس آنے جانے کے درمیان ہنستے ہنساتے، روتے رلاتے، چلتے چلاتے کچھ ایسے واقعات ہو جاتے ہیں